© rasailojaraid.com

مقالات

جناب رفیق حسین نیازی ایڈووکیٹ
متعلم المعہد العالی للشریعۃ والقضاء

گزشتہ سے پیوستہ (آخری قسط)

اسلامی دستور اور فقہی اختلافات

۴۔ جہاں تک چوتھے نقطۂ نظر کا تعلق ہے تو یہ انتہائی خصوصی اہمیت کا حامل ہے اور ایک لحاظ سے اسے حکومتی نقطۂ نظر بھی گردانا جا سکتا ہے کیونکہ حکومت کے شرعی اداروں سے وابستہ ارکان اس کے سب سے بڑے مؤید ہیں۔ ان کے نزدیک اصل کام معاشرہ میں قوانین شرعیہ کی عملداری کا ہے، اس لیے موجودہ دور کے تقاضوں سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہونے اور ترقی پذیر دُنیا کے ساتھ قدم بہ قدم چلنے کے لیے کسی حد تک ناگزیر ہے کہ فقہ اسلامی کو دو واضح حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ان کے نزدیک فقہ اسلامی کا غیر متبدل حصّہ تو بہرحال واجب النفاذ ہے لیکن متبدل حصّہ عصری تقاضوں اور زمان و مکان کی ضرورتوں کے مطابق بدلتا رہے گا۔ اس میں یہ تبدیلی اجتہاد رائے کے تحت عمل میں آئے گی اور قیاس و اجماع کے اجتہادی ماخذ قانون استعمال کرتے ہوئے تغیّر و تبدّل روا رکھا جائے گا۔

وہ اپنے اس نقطۂ نظر کے حق میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اس اصول کی تائید خود فقہی مذاہب کے اندرونی نظائر سے ملتی ہے۔ مثلاً فقہ حنفی میں خود امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کے اختلافِ اقوال میں سے بعد کے فقہاء نے عصری تقاضوں کی روشنی میں اجتہادِ ترجیحی کے ذریعے کسی ایک قول کو اپنا لیا۔ "مجلۃ الاحکام العدلیہ"، "فتاویٰ عالمگیری" اور دیگر قانونی مجموعوں میں یہی روش اختیار کی گئی ہے۔ ادھر عرصہ سے خود فقہائے ہند نے "زوج مفقود الخبر" کے مسئلہ میں فقہ حنفی کے بجائے فقہ مالکی کے مسلک کو ترجیح دی ہے۔ اسی طرح اس کی مثال امام شافعیؒ کے قدیم اور جدید مذہب کا اختلاف ہے کہ ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ماحول اور علاقہ میں جو مذہب آپ نے قابلِ قبول سمجھا۔ دوسرے علاقے اور ماحول میں جا کر اسے ناقابلِ عمل سمجھتے ہوئے ترک کر دیا۔

اس نقطہ نظر میں ایک بنیادی اور اہم بات یہ ہے کہ فقہ اسلامی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ایک معتد بہ حصّہ کو کسی تغیر و تبدل سے ماوراء قرار دیا جا رہا ہے، جبکہ فقہ اسلامی کے ایک بڑے حصّہ کو اجتہادی کاوشوں اور غور و فکر کے تحت لا کر عصری تقاضوں اور دورِ جدید کی ضرورتوں کے مطابق تغیر پذیر قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہاں اصل مشکل یہ سامنے ہو گی کہ وہ لوگ جو قابلِ تغیر و تبدل حصّہ کو عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے والے ہوں گے، ان کا رجحان اگر غیر متبدل فقہ کی جانب زیادہ ہوا تو لامحالہ نتیجہ فقہی جمود کی صورت میں سامنے آئے گا اور اگر ان کا رجحان تغیر و تبدل کے پیشِ نظر مزعومہ اجتہاد کی طرف ہو گیا، تو ہر چیز تغیر و تبدل کا شکار ہونا شروع ہو جائے گی۔ جس کا خطرناک پہلو یہ ہے کہ عصری تقاضوں اور وقتی ضرورتوں کی آڑ میں تبدیلی ہی کو ایک اہم اصول تسلیم کر لیا جائے گا اور اس طرح جدید ذہن اور معاشرتی طرزِ فکر کا وہ غلبہ ہو گا کہ اقبال کی زبان میں ہے

از اجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدائے رفتگاں محفوظ تر

دراصل یہ طرزِ فکر ان لوگوں کی ہے جو اسلام کا لبادہ بھی اوڑھے رکھنا چاہتے ہیں اور فکر و عمل کی زیادہ سے زیادہ آزادی کے بھی شیدائی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح تبدل اور تغیر پذیر حصہ فقہ کے اصول و حدود قائم کرنے والے وہی لوگ ہوں گے جو عہدِ جدید کی نام نہاد ترقی کی چکا چوند سے مرعوب ہو کر ہر ناجائز کو جائز ثابت کرنے پر تلے ہوتے ہیں اور مسلمانوں کو بھی اسی طرف راغب کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

یوں فقہ اسلامی، بلکہ کتاب و سنت بھی ان لوگوں کے ہاتھوں بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گی۔ دراصل یہ لوگ چاہتے ہیں کہ خدا اور رسولؐ کی تعلیمات سے قطع نظر کرتے ہوئے مغربی تہذیب کے سامنے امتِ مسلمہ کو سرنگوں کر دیا جائے جو اس منشائے الٰہی سے سراسر بغاوت و سرکشی کے مترادف ہے:

"هُوَ الَّذِيْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ" (التوبۃ: ۳۳)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یعنی "اللہ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا کہ وُہ اسے غالب کر دے (سارے بقیہ دینوں پر) خواہ مشرکوں کو (کیسا ہی) ناگوار ہو!"

۵۔ پانچویں نقطۂ نظر کے حاملین کا اصرار یہ ہے کہ ملک میں جتنے بھی فرقے پائے جاتے ہیں۔ ملک کا عام قانون ہر فرقہ کی فقہ کے مطابق بنایا جائے۔ یعنی جتنے فرقے ہوں اتنے ہی قانون مرتب کیے جائیں۔ علاوہ ازیں اجتہاد کی اجازت بھی ہر فرقہ کو اسی طرح دی جائے جس طرح اس فقہ کے اندر ہر فرقہ کے ماننے والوں کو حاصل ہے تاکہ وُہ کسی بھی صورت میں اپنی اپنی فقہ سے انحراف کے مرتکب نہ ہونے پائیں، اور اس طرح کسی بھی فرقہ کے اجتہادات کو دوسرے فرقوں پر مسلط نہ کیا جائے۔

دراصل ان لوگوں کا استدلال یہ ہے کہ فقہی اختلافات چونکہ فہم اور تحقیق کے اختلافات ہیں، لہٰذا ان کو ختم کرنا ایک سعی لاحاصل ہے۔ چنانچہ حکومت کا جبر بھی اس ضمن میں ایک طرح سے ناروا اور بے دلیل بن جاتا ہے۔ ان کے نزدیک موجودہ صورتِ حال کا واحد حل یہ ہے کہ فقہی اختلافات کو بعینہٖ تسلیم کرتے ہوئے ہر فرقہ کو یہ حق دیا جائے کہ وُہ اپنے مسلک و طریق کے مطابق زندگی گزار سکے۔

مشہور شیعہ عالم اور تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ کے قائد مفتی جعفر حسین کے مندرجہ ذیل الفاظ اس ضمن میں قابلِ غور ہیں:

"بنیادی چیز یہی ہے کہ ہمیں اور تمام مکاتبِ فکر کو پوری حریت اور آزادی دی جائے تاکہ وُہ اپنے مسلک کے مطابق عمل پیرا ہوں۔ اسی صورت میں ہم میں اتحاد پیدا ہو سکتا ہے اور اگر ہم پر کوئی ایسی چیز مسلط کی جائے، جس کو ہمارا ضمیر نہ مانتا ہو۔ ہمارا دل قبول نہ کرتا ہو، تو یقیناً وُہ دیرپا چیز نہیں ہو سکتی اور اس قانونِ اسلامی کو دیرپا بنانے کے لیے ضروری ہے کہ شیعہ شیعہ رہے، سنی سنی رہے۔ سنی حضرات اپنے مسلک کی پابندی اور شیعہ حضرات اپنے مسلک کی پابندی کریں۔" [۱]

اس نقطۂ نظر کے نزدیک قانونِ اسلامی میں ہر شخص کو اپنی اپنی فقہ کے دائرہ کار میں

---

[۱] رپورٹ تقاریر و تجاویز علماء کنونشن منعقدہ ۱۹۸۰ء صفحہ ۱۶۴۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اجتہاد، تحقیق کی آزادی حاصل ہونی چاہیے اور کسی فرقہ کی تحقیق اور اجتہاد کو دوسرے فرقہ پر محض اس لیے مسلط نہ کیا جائے کہ اس ملک میں ان کی اکثریت ہے۔ مثلاً اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنے کی ہے۔ اب یہ اختلاف کہ چور کا ہاتھ کہاں سے کاٹا جائے؟ ایک اجتہادی اور تحقیقی امر ہے۔ لہٰذا ہر فرقہ کو اپنے اجتہاد پر عمل پیرا ہونے کی پوری آزادی حاصل ہونی چاہیے۔

اس نقطۂ نظر کے تحت درج ذیل باتیں غور طلب ہیں:

(۱) پہلی بات تو یہ کہ یہ ایک ایسے فرقہ کا نقطۂ نظر ہے جو اپنے آپ کو ملّتِ اسلامیہ کا اٹوٹ انگ سمجھتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا یہ اصرار بھی ہے کہ اسے ہر لحاظ سے لامحدود آزادی حاصل ہونی چاہیے، جو محلِ نظر ہے۔ یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ اگر یہ فرقہ امتِ مسلمہ کا ہی ایک حصّہ ہے تو اس کے حاملین کم از کم کوئی قدرِ مشترک تو باقی رکھیں، جس سے اپنوں اور غیروں کو کسی نہ کسی حد تک یہ احساس ہوتا رہے کہ ان کا یہ دعوٰی بجا ہے اور وہ بھی امتِ مسلمہ میں شامل ہیں، ورنہ اگر پرسنل لاء کے ساتھ پبلک لاء میں بھی ان کی راہیں اپنے دینی بھائیوں سے یکسر مختلف ہوں تو کون یہ باور کرے گا کہ یہ اُن ہی سے ملتی جلتی ایک اقلیت ہے؟

اس بدیہی حقیقت کے بالکل برعکس اس کے اکابر یہ چاہتے ہیں کہ شیعہ، شیعہ رہے اور سنّی، سنّی رہے۔ سنّی حضرات اپنے مسلک کی پابندی کریں اور شیعہ حضرات اپنے مسلک کی پابندی کریں، اور اس مسلک کے لیے کوئی دائرہ کار اور حدود کی پابندی قبول کرنے کے لیے بھی تیار نہیں۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ اسلامی آئین وقانون کے نفاذ کے بعد شیعہ حضرات اسی طرح کی آواز بلند کرنا چاہتے ہیں، جس طرح کہ تحریکِ قیامِ پاکستان سے قبل مسلمانانِ ہند نے ہندوؤں کے خلاف برپا کی تھی۔ یعنی وہ انہیں یہ کہتے تھے کہ ہمارا سب کچھ تم سے الگ ہے، اس لیے تم سے الگ رہے بغیر ہماری آزادیٔ فکر وعمل مجروح ہوتی ہے۔ چنانچہ یقین، اتحاد، تنظیم کے بل بوتے پر وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گئے۔ تو یہ گاڑی کہاں جا کر دم لے گی؟ عجیب منطق ہے، شیعہ حضرات کا ایک طرف تو یہ دعوٰی ہے کہ وہ ملّتِ اسلامیہ کا جزوِ لاینفک ہیں۔ لیکن دوسری طرف ان کے مطالبات بعینہٖ وہی ہیں جو کسی خطّے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہنے والے ایسے طبقے کے ہوتے ہیں جو کسی بھی معاملہ میں اسی خطہ کے دوسرے طبقہ سے اشتراک اور یک جہتی و ہم آہنگی کو اپنے فرقہ وارانہ اتحاد کے لیے زہرِ قاتل سمجھتا ہے! ــــ ان کا یہ موقف ریاست در ریاست کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے؟ مسجد کے اندر ہی اپنی ڈیڑھ انچ کی ایک الگ مسجد تعمیر کرنا اسلامی اخوت اور بھائی چارے کی روح کے خلاف ہے۔ ملک کے دوسرے فرقوں اور طبقوں کی یہ کوشش تحسین کے قابل ہے کہ وہ ہزار اختلاف کے باوجود شیعہ حضرات کے اس دعوے سے ذرا بھی انکار نہیں کرتے کہ وہ ہماری ہی طرح امتِ مسلمہ کا ایک حصہ ہیں۔ لیکن افسوس کہ شیعہ حضرات جس بات پر اڑے ہوئے ہیں وہ خود ان کے اس دعوی کو باطل قرار دیتی ہے۔

(ب) اس سلسلہ میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ دنیائے اسلام کا واحد ملک، جہاں شیعہ حضرات کی اکثریت ہے، وہاں اسلامی انقلاب کے بعد تشکیل پانے والا آئین و دستور پبلک لاء تو وہی رکھا گیا جو ملک کے اکثریتی فرقہ یعنی شیعہ کے مسلک فقہ جعفریہ پر مبنی ہے۔ لیکن پرسنل لاء میں ہر شہری کو آزادی حاصل ہے۔ ایسے میں پاکستان کی شیعہ جماعت کیوں ایسے موقف پر مصر ہے، جسے انہی کے فرقہ کے لوگوں نے برسرِ اقتدار آکر ناقابلِ عمل قرار دے دیا ہے؟ آخر انہوں نے اکثریت میں ہونے کے باوجود وہ کچھ کیوں نہیں کر ڈالا جو کچھ یہاں کے شیعہ حضرات سنی اکثریت سے کروانا چاہتے ہیں۔؟

(ج) اگر شیعہ حضرات اپنے اس موقف پر واقعی اتنا گہرا اعتماد و یقین رکھتے ہیں تو ان کے علماء کرام کا یہ فرض ہے کہ وہ دلائل و براہین کے ساتھ اپنا موقف پبلش کریں ہمیں یقین ہے کہ وہ پوری دنیا کے کسی ایسے ملک کی مثال پیش نہیں کر سکتے۔ جس میں اس طرح کی صورتِ حال پائی جاتی ہو یا وہاں کی کسی اقلیت نے اس ملک کا حصہ رہتے ہوئے اس طرح کے مطالبات کیے ہوں بلکہ اس طرح کے مطالبات کرنے والے تو باغی کہلائے جانے کے زیادہ مستحق ہیں، یا وہ خود اپنے آپ کو حریت پسند کہلوانا زیادہ پسند کریں گے۔

بہرحال اہلِ علم و نظر کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر طرح کے تعصب اور گروہ بندی سے بالاتر ہو کر ایک لمحہ کے لیے یہ تصور کریں کہ آیا یہ بات ممکن العمل بھی ہے یا نہیں؟

اسلامک ریپبلک آف ایران کی مثال ہم نے پلیش کر دی ہے۔ ہمارے خیال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں اگر ذرا سی گنجائش اس بات کی ہوتی کہ اقلیتی فرقوں کے پبلک لاء بھی اپنے اپنے بحال رکھے جائیں تو سب سے پہلے ان ہی کا فرض تھا کہ وہ سنیوں کو اپنے ملک میں اس بات کی اجازت دے کر مثال قائم کرتے، تاکہ دوسرے اسلامی ممالک ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس پالیسی پر عمل کرتے۔

دراصل گوشت پوست کے انسانوں کی دنیا میں یہ بات ممکن ہی نہیں کہ ایک ہی ملک میں ایک سے زیادہ پبلک لاء، ایک سے زیادہ آئین اور ایک سے زیادہ ایسے طبقے موجود ہوں جو یہ چاہتے ہوں کہ حکومت چاہے اکثریت کی ہو لیکن ان کا سب کچھ ان کے مسلک اور پسند کے مطابق ہو۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ ملک کو واضح طور پر تقسیم کر دیا جائے۔ دراصل قومی یکجہتی اور اتحاد و یگانگت کسی صورت میں قائم ہی نہیں رکھی جا سکتی، جبکہ دو بالکل ہی متوازی بلکہ متصادم نقطہائے نظر ایک ہی ملک میں اس طرح پرورش پانے لگیں جس طرح کا شیعہ حضرات کا مطالبہ ہے۔ ایسے میں دوسری اقلیتوں کو کس دلیل کے تحت اس مطالبہ سے روکا جا سکے گا کہ اگر ایک ملک کے اندر ہی ایک فرقہ کو یہ رخصتیں دے دی گئی ہیں تو ہمیں کیوں ایسی ہی رعایت سے محروم رکھا جا رہا ہے؟

(د) اگر تاریخی نقطہ نظر سے بھی شیعہ حضرات کے ان مطالبات کا جائزہ لیا جائے تو ان کے علماء کرام کے اس دعوای کا شیعہ حضرات کے پاس کوئی جواب نہیں کہ فقہ جعفریہ کی مستند کتابیں اس طرح کے مطالبات سے بالکل پاک ہیں بلکہ وہاں تو پرسنل لاء میں بھی بہت حد تک اشتراک اور یک جہتی نظر آتی ہے۔ آخر فقہ جعفریہ کی بنیاد اور اساس ان کے اکابر علماء کی نظر میں وہی ہے جسے دوسرے فرقے بھی بنیاد مانتے ہیں، مثلاً کتاب و سنت، اجماع، اجتہاد وغیرہ۔ ایسے میں معاذ اللہ یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ کتاب و سنت میں بھی دو دو باتیں ہیں؟ —— پھر شیعہ اور سنی ہی دو فرقے نہیں ہیں بلکہ ہر ایک کے متعدد فرقے ہیں۔ اگر شیعہ اور سنی کو الگ الگ دستور و قانون کے وضع کرنے کا اختیار دے دیا جائے تو ان کے متعدد فرقوں میں یہ فیصلہ کیسے ہوگا کہ عام قانون کسی خاص گروہ کی فقہی ترجیحات پر مبنی ہوگا؟ گویا اس طرح سے فقہی تقسیم لامحدود ہو کر سینکڑوں فقہی اختلافات کو جنم دے گی۔ کیا اتنا شدید

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دستوری انتشار کسی مملکت کے وجود کو قائم رکھ سکے گا؟ علاوہ ازیں . . . . مسلمانوں ہی کے وہ مکاتب فکر، جو شیعہ اور سنی فقہ کی پابندی نہیں کرتے، یا غیر مسلموں کے مختلف گروہ، اسی بنیاد پر یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب نہ ہوں گے کہ عام قانون میں ان کو بھی مستقل دستور اپنانے کا حق دیا جائے؟

آخر میں ہم بڑی دردمندی اور خلوصِ نیت سے اپنے شیعہ بھائیوں سے یہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس وقت، جبکہ پاکستان میں شریعت کی عملداری کی کوششیں ہو رہی ہیں اس طرح کے مطالبات سامنے لاکر اسے ناکام کرنے کے ذمہ دار نہ بنیں گے بلکہ "تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی" کی روح کے مطابق اپنا سارا وزن مخالفت کی بجائے حمایت کے پلڑے میں ڈال دیں۔ یقیناً ان کا یہ جذبہ ایثار اور قربانی کے مترادف ہوگا۔

۶۔ چھٹا نقطہ نظر اسلام کو ایک حرکی نظریہ حیات تسلیم کرتے ہوئے اسے عصرِ جدید کے تقاضوں اور ضرورتوں سے کماحقہٗ عہدہ برآ دیکھنے کے لیے اجتماعی اجتہاد کی ضرورت پر زیادہ زور دیتا ہے۔ اس نقطہ نظر کے حامل افراد فقہی جمود کو پوری امت کے لیے زبوں حالی اور پسماندگی کا سبب خیال کرتے ہیں اور تقلید کی شدید مذمت کرتے ہیں ــــــ البتہ اختلافات کے افراط سے بچنے کے لیے انفرادی اجتہاد کی بجائے قومی اور اجتماعی اجتہاد کو جس کو وہ اجماع کا نام دیتے ہیں، امتِ مسلمہ کے گوناگوں مسائل اور اختلافات کا حل سمجھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ مجلسِ قانون ساز کو یہ حق تفویض کرتے ہیں کہ وہ اجتماعی اجتہاد کے نام پر فقہ کی تشکیل جدید کرے، اس ضمن میں علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کی رائے ملاحظہ ہو:

"بہرحال یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ دنیا میں جو نئی قوتیں ابھر رہی ہیں، کچھ ان کے اور کچھ مغربی اقوام کے سیاسی تجربات کے پیشِ نظر مسلمانوں کے ذہن میں بھی اجماع کی قدر و قیمت اور اس کے مخفی امکانات کا شعور پیدا ہو رہا ہے۔ بلادِ اسلامیہ میں جمہوری روح کا نشوونما اور قانون ساز مجالس کا بتدریج قیام ایک بڑا ترقی پذیر قدم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مذاہبِ اربعہ کے نمائندے جو سر دست فرداً فرداً اجتہاد کا حق رکھتے ہیں۔ اپنا یہ حق مجالسِ تشریعی کو منتقل کر دیں گے۔

یوں بھی مسلمان چونکہ متعدد فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اس لیے ممکن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی ہے تو اجماع کی یہی شکل ہے"۔ [۱]

فکرِ اقبال کے ایک شارح پروفیسر منوّر مرزا اس بات کو یوں بیان کرتے ہیں:

"مجالسِ تشریعی کے توسط سے رُوپذیر ہونے والے اجماع کو حضرت علامہ کے نزدیک اس قدر اہمیت اس لیے حاصل ہے کہ اس طریق سے مختلف ملکوں کے اہلِ نظر و قانون کے باہم قریب آجانے کی امید ہو گی۔ لہٰذا انفرادی، ملکی بلکہ فرقہ وارانہ اجتہاد کی بجائے مجلسِ تشریعی کے اجتماعی اجتہاد و اجماع سے اس فکری انتشار اور ملکی انارکی پر قابو پایا جاسکتا ہے"۔ [۲]

اسی نقطہ نظر کے ایک اور اہم مؤید محمد تقی الدین امینی کی دلیل بھی قابلِ غور ہے۔

"اجماع کی اصل اور ممکن العمل صورت یہی ہے کہ قانونی معاملات میں اہلِ حل و عقد کی ایک مجلسِ مشاورت قائم ہو اور حالات و مسائل میں غور و فکر کے بعد ان کا صحیح حل تجویز کرے جو ایک طرف کتاب و سنت کے خلاف نہ ہو اور دوسری طرف ضروریاتِ زندگی سے ہم آہنگی پیدا کرنے والا اور دشواریوں پر قابو پانے والا ہو"۔ [۳]

واضح رہے کہ مندرجہ بالا نقطہ نظر کو عملی شکل دینے میں پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ کے وہ عناصر پیش پیش ہیں جو کہ اسلام پسند طبقہ سے وابستہ ہیں۔

جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے نزدیک اس نقطہ نظر میں بڑی جاذبیت اور پذیرائی ہے اور بظاہر یوں لگتا ہے کہ عہدِ جدید کے گوناگوں مسائل کا حل اس کے سوا کوئی اور نہیں ہے لیکن اگر تھوڑے تعمق کے ساتھ اس نقطہ نظر کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آئے گی کہ اس طرح کی آزادی بہت بڑے فتنہ کا باعث بن سکتی ہے۔ کیونکہ اس نقطہ نظر کی بنیاد پر ایسے اذہان کا پیدا ہو جانا ناممکن نہیں ہے جو جملہ سابقہ فقہوں اور اسلاف کے کارناموں کو اجتماعی اجتہاد کے نام پر ناکارہ قرار دینے کی جسارت سے بھی دریغ نہیں

---

[۱] تشکیل جدید الٰہیات (ترجمہ خطباتِ اقبال از نذیر نیازی) ص ۲۶۸

[۲] سہ ماہی "منہاج" اجتہاد نمبر ص ۴۸

[۳] "فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر" ص ۲۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کریں گے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ نام تو اسلام کا استعمال ہو گا لیکن ہر نئی فکر اور جدید نظریہ مسلمانوں پر ٹھونسنے کی کوشش کی جائے گی۔ اور اگر مجلس قانون ساز میں اسی جدید فکر و نظر کو اکثریت حاصل ہو گئی تو ہر جدید نظریہ کو اسلامی قانون کا رنگ دے دیا جائے گا۔

انفرادی اجتہاد کی کلی تردید اور اجتماعی اجتہاد کے آسان فروغ کا اس کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں کہ کسی بھی جانب سے اور کسی بھی سطح سے اٹھنے والی اجتہادی آواز (اگرچہ وہ کتاب وسنت کے قریب تر ہو، خواہ اس پر سلف متفق ہوں بلکہ ان کا اجماع ہو چکا ہو) محض اس لیے دبا دی جائے کہ اسے جدید اجماع عوام کی سرپرستی حاصل نہیں۔ یہی وہ استبداد ہے جس کا مقابلہ ہر دور میں امت کے جلیل القدر لوگ کرتے آئے ہیں۔ یہ بات کسی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتی کہ ہم اپنے فقہی سرمایہ کو یک قلم منسوخ کر دیں اور ایک ایسی عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کریں جس کے لیے کوئی نقشہ پیشِ نظر نہ ہو۔ اس کے برعکس اگر ہم اسلاف کے کاموں یعنی سابقہ فقہی سرمایہ کو معاون کی حیثیت دیتے ہوئے آگے چلیں تو ہمارا راستہ اور منزل قریب تر ہو جائے گی۔ کسی بھی نئے اجتہاد کے لیے یہ بات ناگزیر ہے کہ آدمی کتاب وسنت پر گہری نظر رکھتا ہو، اسلامی قانون کی پچھلی تاریخ سے پوری طرح واقف ہو، ساتھ ہی مختلف زمانوں میں اس وقت کے مسائل کے حل کے لیے کتاب وسنت سے استنباطِ احکام کے جو طریقے اختیار کیے گئے، ان کا حسن و قبح بھی اس کے پیشِ نظر ہو اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ دین وملت سے مخلص ہو اور دین میں کوئی نئی راہ نکالنے والا نہ ہو۔ آج ہر شخص بدقسمتی سے مجتہد بنا ہوا ہے۔ بالخصوص مغرب زدہ طبقہ اپنے نئے نئے اجتہادات کے ذریعے نت نئے شگوفے چھوڑ رہا ہے، اور مسلم معاشروں میں سخت انتشار پھیلا رہا ہے۔ اقبال ہی کے بقول

ع ہر لئیمے رازدارِ دیں شدہ

اجتماعی اجتہاد کا طریقہ ایک ایسے ملک میں کیونکر اپنایا جا سکتا ہے، جہاں جمہوری سیاسی ادارے ذاتی خود غرضیوں اور علاقائی گروہ بندیوں میں جکڑے ہوئے ہوں اور جن کے نزدیک اقتدار، ایک صحیح اسلامی معاشرہ کے قیام کا نہیں، بلکہ خواہشات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہے؟ ظاہر ہے اس طرح کے معاشرہ میں تشکیل پانے والی مجلسِ قانون ساز، یا مجلسِ مشاورت ایسے لوگوں پر مشتمل ہو گی جو علومِ اسلامی سے قطعی نابلد اور وقت کے تقاضوں سے سراسر نا آشنا ہوں گے۔ لہٰذا ان سے اس طرح کی توقعات کو منسوب کرنا نہ ملک وملت کے ساتھ بھلائی ہے، نہ ہی اسے اسلام سے خیر خواہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔

آخر میں ہم ایک ایسی بات کی طرف اہلِ فکر ونظر کی توجہ مبذول کرائیں گے جس کی اہمیت اس نقطہ نظر کے حوالے سے سب سے زیادہ ہے۔

اس نقطہ نظر کے تحت چونکہ اجتماعی اجتہاد کو شرعی طور پر اجماع کا درجہ دیا گیا ہے اس لیے کسی مجلسِ قانون ساز کے اجماعی فیصلوں کی حیثیت اسلام کے ایک قانون کی سی بن جائے گی۔ جبکہ صورتِ حال یہ ہے کہ عالمِ اسلام کی بے شمار اسمبلیاں مختلف جمہوری اور غیر جمہوری طریقوں سے وجود میں آئیں گی، جو اپنے اپنے حالات اور مسائل کے مطابق قانون سازی کریں گی۔ اور یہ بھی طے نہیں کہ وہ اس کے لیے کون سے اصول ومبادی کی پیروی کریں گی۔

ایسے میں ایک ہی دور میں ایک ہی مسئلہ کے بارے میں ان گنت اجماعی آراء سامنے آ جائیں گی اور یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہو جائے گا کہ کون سی اجماعی رائے اختیار کی جائے اور کس کو ترک کیا جائے؟ نتیجہ شدید اختلاف، انتشار اور تعصب کی صورت میں نکلے گا۔ لہٰذا مندرجہ بالا خدشات کی روشنی میں ہم مجبور ہیں کہ اس پُر خطر راہ کے کھولنے والوں کو حتی الامکان باز رکھنے کی کوشش کریں۔ اسلام حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک برابر چلا آ رہا ہے اور وہ ایسے احکام پر مشتمل ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے واسطے نیکی اور بھلائی کے لیے نازل فرمائے ہیں۔ اس لیے اللہ کے نازل کردہ احکام کے مقابلہ میں کسی انسانی رائے اور عقل و سوچ کو کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ آخر کسی انسان کی رائے یا اکثریتی رائے خدائی حکم کا نعم البدل کیسے بن سکتی ہے؟ اجتہاد چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی، آیات و احادیث میں خدائی منشا کی جستجو کا نام ہے جسے قانون سمجھنا دین سے ناواقفی کی دلیل اور زعم باطل ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ تعالیٰ ہمیں غلط راستوں پر چلنے سے بچنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین!

۷۔ ساتواں نقطہ نظر چھٹے نقطہ نظر کی ہی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ البتہ سیاسی لحاظ سے یہ دونوں ایک دوسرے سے متصادم نظریات پر اپنی اساس رکھتے ہیں۔ یعنی ایک اگر اجتماعی اجتہاد کی آڑ میں جمہوری طرز پر منتخب ہونے والی مجلس قانون ساز کو قانون سازی کے مطلق اختیار دیتا ہے تو دوسرا انفرادی اور اجتماعی اجتہادات پیش کرنے کا حق صرف حکومتِ وقت سے منسوب کرتا ہے۔ ایک اکثریتی آمریت اور دوسرا ریاستی آمریت کو اسلام کی نمائندگی کا کلی حق سونپ کر خدائی اختیارات میں مداخلت کا مرتکب ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک اگر اکثریتی عوامی نمائندوں کو شریعت سازی تو دوسرا بے لگام حاکموں کو، اللہ تعالیٰ کی منشاء کی تشریح و تعبیر . . . کے منصب پر فائز کرتا ہے۔

یہ نظریہ غلام احمد پرویز صاحب کے فکر سے وابستہ ہے ان کے نزدیک اجتہاد خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، اسے اجماع کی حیثیت اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب وُہ سرکاری طور پر نافذ العمل ہو گا۔ اپنے اس نظریہ کو مزید مزیّن کرنے کے لیے پرویز صاحب نے اپنے اجتہاد کے منبع کو "مرکزِ ملت" قرار دیا ہے اور اسے ریاست کے مقام پر فائز کر دیا ہے۔ گویا کہ برسرِ اقتدار پارٹی یعنی حکومت قرآن کے نام پر جو قانون سازی بھی کرے گی وُہ قوم کے لیے آخری سند ہو گی اور وُہ اسے "وحدتِ امت" کا واحد ذریعہ بتلاتے ہیں[1]

دراصل یہ نظریہ جدید منکرینِ سنت وحدیث کا ہے، جو سنت کی تعبیر و تشریح سے آزاد ہو کر قرآنِ پاک میں من مانی تاویلات، تعبیرات اور تشریحات کا راستہ کھول کر ایسے فکر و عمل کو ترویج دینا چاہتے ہیں، جو اپنی مغرب زدہ عقل کو اسلامی احکام پر حاکم بنا دے۔

مقامِ شکر ہے کہ ہمارے علماء کرام نے اس لغو اور خطرناک نقطہ نظر کو ہر طرح سے

---

[1] درحقیقت یہ نظریہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کے ردِ عمل میں اشتراکی آمریت سے متاثر ہو کر اختیار کیا گیا ہے، جو سرمایہ داریت کی انتہائی شکل ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بے ہودہ اور غیر اسلامی ثابت کر دیا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر سنّتِ رسول اللہ کی آئینی حیثیت اور حجیت و قطعیت کالعدم ہو جائے تو اسلام کے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے؟ اور پھر ہمارے پاس کون سی بنیاد بچ رہے گی جس کی مدد سے ہم قرآن کی من مانی اور نفسانی تاویلات کرنے والوں کا منہ بند کر سکیں گے؛

نیز وحدتِ امت کے اس نعرہ سے مسلمانوں کی سابقہ تاریخ کو جس بری طرح سے ملیامیٹ کر دیا گیا ہے وُہ اپنی جگہ ایک بہت بڑا المیہ ہے اور اس کے نتائج و عواقب پر غور کرنے سے یہ تلخ حقیقت سامنے آئے گی کہ اس نے گویا امت کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ کر اُسے ہوا میں معلق کر دیا ہے اور اس طرح ہر شے سے اس کا رابطہ منقطع ہو گیا ہے۔ وُہ اپنے ماضی سے یوں کٹ چکی ہے کہ سنت کے انکار کے بعد ماضی اُس کے لیے کسی کام کا نہیں رہ گیا، جبکہ اپنا مستقبل اس نے دُوسروں کے سپرد کر دیا ہے چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قادیانیوں نے غلام احمد قادیانی کو جنم دے کر ختمِ رسالت پر ایک وار کیا ہے لیکن غلام احمد پرویز نے یہ نقطہ نظر پیش کر کے ہزاروں وار کر دیے ہیں۔ گویا کہ آج تک محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حکومت کے بعد مسلمانوں کی تمام حکومتیں، جو اسلام کے نام پر قرآن کی غلط یا صحیح، جو بھی تعبیریں کرتی رہی ہیں، وُہ خدا کی رضا اور اس کا قانون تھا۔ اور آئندہ بھی جو نام نہاد قرآنی حکومتیں آئیں گی وُہ بھی خدا کی رضا ہوں گی۔ چنانچہ اس طرح سے قانونی تغیر کے تسلسل کو جو دائمی حیثیت دے دی گئی ہے، وُہ ہر دم ہر علاقے میں ایک نیا رسول جنم دینے کے مترادف ہے۔

متذکرہ بالا ساتوں نقطہائے نظر اور ان پر نقد و تبصرہ سے یہ حقیقت عیاں ہو کر سامنے آگئی ہے کہ گو یہ نقطہائے نظر اپنی اپنی جگہ پر صداقت کا کوئی نہ کوئی پہلو رکھتے ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی ایسے تعصبات اور فرقہ واریت کے جراثیم کی افزائش کا باعث بن سکتے ہیں جو اسلامی قانون کی عملداری میں مزید رکاوٹ پیدا کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں ہمارے بحیثیتِ مجموعی بھی چند خدشات ہیں جنھیں ہم مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

(۱) پہلا نکتہ یہ ہے کہ دستور و قانون خواہ شرعی ہو، سیکولر ہو، عوام کی جمہوری مرضی کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تابع ہو، یہ حاکمِ اعلیٰ کی منشاء کا دوسرا نام ہے۔ لہٰذا اسی حاکمِ اعلیٰ کے احترام و تقدس سے اس کی پابندی وابستہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اسے اپنے ان شخصی یا نظری سرپرستوں کی حمایت حاصل نہ رہے۔ تو وہ خواہ کتنا ہی بلند و بالا کیوں نہ ہو، اس کی قانونی اور آئینی حیثیت معطل ہو کر رہ جائے گی۔ اس لیے کوئی دستور بھی اگر حاکمِ اعلیٰ کی منشاء سے علیحدہ ہو جائے گا تو اسے قانونی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ شریعت میں یہ حیثیت صرف کتاب و سنت کو حاصل ہے یا کسی قدیم و جدید فقہ اور وضعی قانون کو؟

(ب) دستور و قانون کی ایک خاص وضع اور شکل ہوتی ہے، جس کے لیے ایک طرف اس کے الفاظ، اور دوسری طرف اس کی مثالی تعبیر اور عملی شکل ہوتی ہے۔ اور اگر یہ دونوں (الفاظ و تعبیر) چیزیں متفقہ ہوں۔ باہم مربوط ہوں تو فروعی اور جزوی اختلافات کے باوجود ملت کی وحدت اور یکجہتی کی حفاظت کی جا سکتی ہے، بشرطیکہ دیگر اختلافات کو مثالی اور قانونی حیثیت حاصل نہ ہو اور کوئی ایسا طریقۂ کار اختیار کیا جائے جو اختلافی تعبیروں اور تشریحات کو مناسب حیثیت تو دے لیکن دستور کا حصہ قرار دے کر دستور کو متنازعہ فیہ نہ بنا دے ـــــ کتاب و سنت اور فقہ قدیم یا وضعی قانون کی دستوری حیثیت کا اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے ہوئے اس بات کا پاس و لحاظ رکھنا بڑا اہم ہے۔

(ج) دستور و آئین کے جدید تصورات میں کسی مملکت کا دستور سب سے اعلیٰ دستاویز ہوتی ہے۔ اگر کوئی شے اس سے اعلیٰ تر ہو تو اسے اصل دستور و آئین گردانا جاتا ہے۔ لہٰذا کتاب و سنت سے ماخوذ کسی فقہ یا جدید قانون کو اگر دستوری حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے تو یہی اعلیٰ تر دستاویز بن جائے گی اور اس کا مرتبہ کتاب و سنت سے برتر قرار پائے گا۔ چاہے یہ بات تحریری طور پر سامنے آئے یا نہ آئے۔

(د) چونکہ دستور و آئین کسی خاص ریاست کا نقشہ اور بنیاد ہوتا ہے۔ اس لیے اصولی طور پر ریاست کے وجود کا انحصار اس پہ ہوتا ہے۔ لہٰذا جب ایک دستور نافذ ہو جائے تو اسے منسوخ یا تبدیل کرنا کسی صورت میں بھی جائز اور روا نہیں۔ اس اصول کے تحت رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ سے قرآنِ مجید کا بطورِ دستور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نفاذ لامحدود عرصہ یعنی تاقیامت ابدی ہے جس کا عملی نمونہ بھی کتبِ حدیث میں من وعن محفوظ ہے۔ اس لیے کسی فقہ کو دستوری حیثیت دینے سے پہلے اس بات کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ کیا کتاب وسنت یا ان دونوں میں سے کسی ایک کا نفاذ ختم ہو چکا ہے؟ ساتھ ہی یہ بھی بتانا ہوگا کہ یہ کب اور کیسے ختم ہوا اور اس کی وجوہات کیا تھیں، نیز ایسے کسی اقدام کا کوئی جواز بھی ہے یا نہیں؟ تاکہ ہم اس کے بعد کوئی نیا دستور وضع کر سکیں۔[1]

---

[1] ان نکات کے پیش کرنے کا مطلب یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم علماء کی مختلف آراء یا فقہوں سے استفادہ کے قائل نہیں۔ یہ اجتہادی کاوشیں لائقِ صد تحسین ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی صرفِ نظر ممکن نہیں کہ ان اجتہادی کاوشوں کے پیچھے علمی رجحانات، عرفِ زمانہ اور پیش آمدہ مسائل کی مخصوص نوعیت بھی کارفرما رہی ہے۔ اس لیے نوعیت اور مسائل کے بدلنے سے اجتہادی رائے بھی بدل جائے گی۔ لہٰذا علماء کی آراء کا جو باہمی اختلاف نظر آتا ہے اس کا بڑا حصہ ایسی نوعیتوں اور مسائل کی تبدیلی کی بناء پر بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت تو کامل اور دائمی ہے، لیکن علماء اور فقہاء کی آراء کی حیثیت دائمی اور کامل نہیں ہے۔ پھر بعدِ زمانہ سے جب حالات اور عرف میں کافی تبدیلی آچکی ہو۔ اور تہذیب وتمدن بھی نئے رنگ اختیار کر چکے ہوں تو سابقہ فقہوں کو من وعن قانونی حیثیت دینا قطعاً درست نہیں ہے۔ اسی طرح اکثریت واقلیت کی بناء پر مخصوص رائے کو قبول کرنا کسی طور پر معقول نہیں۔ اصل شے کتاب وسنت ہے جو الہامی ہونے کی بناء پر کامل واکمل ہے اور ابدی بھی۔ چاہیے یہ کہ جب بھی کوئی نیا مسئلہ یا الجھن درپیش ہو، سابقہ یا جدید فقہوں سے قانونی نظائر کے طور پر استفادہ کیا جائے اور کتاب وسنت کی منشاء سمجھنے کے لیے اس فقہی رائے سے تائید حاصل کی جائے جو پیش آمدہ مسئلہ میں زیادہ واضح ہو۔ اسی طرح سے زمانے کی مقتضیات اور عامۃ الناس کی بہبودی کا لحاظ رہے گا اور منشائے الٰہی میں تبدیلی لازم نہ آئے گی۔ ایسی رائے کو تائیدی طور پر اپنانے سے حنفی، شافعی، جعفری، ظاہری یا کسی بھی جدید فقہ سے تعصب مناسب نہ ہوگا، کیونکہ ممکن ہے کہ باہمی اختلافی آراء میں سے کسی مسئلہ میں اگر ایک فقیہ کی رائے پیش آمدہ مسئلہ میں منشائے الٰہی کے زیادہ قریب ہو تو دوسرے مسئلہ میں کسی دیگر فقیہ کی۔ نیز اس طریقہ سے فرقہ وارانہ تعصب، گروہ بندی اور شخصیت پرستی کی حوصلہ شکنی بھی ممکن ہوگی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ملک و ملت میں پائے جانے والے مختلف نقطہائے نظر کے بیان، محاکمہ اور اپنی تصریحات کے بعد ہم اب اس پوزیشن میں ہیں کہ اپنی تحقیق اور علم کے مطابق مربوط شکل میں اپنے خیالات قارئین کے سامنے رکھ سکیں۔ تاکہ انہیں یہ اطمینان حاصل ہو کہ ان تنقیدی دلائل کے ساتھ ساتھ ایک مثبت نقطۂ نظر بھی موجود ہے جو ہمارے خیال میں کسی کے لیے بھی ناقابلِ قبول نہ ہوگا۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم سب کا ایمان ہے کہ اس کائناتِ ارضی کا مالک اور حاکمِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اس نے انسانوں کو اپنی آزاد مرضی پر نہیں چھوڑ دیا بلکہ اپنی رضاء و منشاء اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعے ان تک پہنچاتا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی آخری اور مکمل رضا صرف وہی شکل ہے جو شریعتِ محمدیہ (قرآن) کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے اور اس کا دوسرا پہلو جسے شریعتِ محمدیہ کی اعلیٰ اور اکمل مثال بلکہ امتیاز قرار دیا جاسکتا ہے، سنتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) ہے۔ جیسے قرآن کریم کی تعبیر میں ایک آخری سند کی حیثیت حاصل ہے گویا کہ شریعتِ محمدیہ کتاب و سنت کا نام ہے، جس میں کتاب اللہ کی صورت میں الفاظ کا پہلو ظاہر کرنا مقصود ہے تو سنت کی صورت میں معنیٰ و مقصود کا پہلو واضح کرنا مطلوب ہے۔ چنانچہ ان الفاظ و تعبیر کے بعد جتنی بھی تعبیریں ہوں گی وہ صرف شریعت کے فہم کی کوشش شمار ہوگی، لیکن ان کو ذاتِ شریعت یا الہامی قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی ان کو دائمی یا ابدی حیثیت حاصل ہوگی۔

پس شریعتِ محمدیہ میں بنیادی دستور کی حیثیت صرف کتاب و سنت کو حاصل ہے اور اس حیثیت میں کتاب و سنت کا کوئی فہم یا تعبیر اس میں شامل نہیں ہے۔ اس لیے یہ تصور ہی محلِ نظر ہے کہ کتاب و سنت جیسے دستور کی موجودگی میں مسلمانوں کے لیے کسی نئے دستور و قانون کی ضرورت ہے، چاہے یہ دعویٰ ہی کیوں نہ ہو کہ وہ کتاب و سنت یا کسی مستند فقہ سے ماخوذ ہے۔ بلکہ کتاب و سنت کو بذاتہٖ دستوری حیثیت حاصل ہے اور اہلِ علم سے یہ بات مخفی نہیں کہ مسلمانوں کے جملہ مکاتبِ فکر کا کتاب و سنت کو منشائے الٰہی کی حیثیت سے تسلیم کرنے پر ہر دور میں مکمل اجماع رہا ہے۔ رہے فقہی اختلافات تو ان کی حیثیت دستوری یا اساسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اختلافات کی ہرگز نہیں۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ کوئی بھی فقہ دستور کا حصّہ نہ پہلے کبھی رہی ہے اور نہ ہی اب ہو سکتی ہے۔ ہاں دستور پر عملدرآمد کے لیے یہ ایک معاون کا کردار ضرور ادا کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہی آراء کے متعدد ہونے سے شریعت کا متعدد ہونا لازم نہیں آتا۔

چونکہ شریعت اور فقہ میں حیثیت اور دائرۂ کار کے لحاظ سے خاصا فرق ہے، اس لیے کوئی متعصب سے متعصب شخص، حتیٰ کہ مستشرقین بھی، یہ بات بطورِ اصول ماننے کی جسارت نہیں کرتے کہ مختلف ائمہ سے منسوب فقہیں اسلام میں مختلف شریعتوں کے مترادف ہیں۔

بہر حال ہمارا یہ دعویٰ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ایک اسلامی مملکت میں دستور کی حیثیت صرف اور صرف کتاب وسنت کو حاصل ہے جس کا دوسرا قرآنی نام شریعت ہے۔ اس ضمن میں اگرچہ فقہ کے تعاون کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ تاہم اسے دستور کی حیثیت حاصل نہیں۔

جب ہم قرآنِ مجید کو بطورِ دستور اپنانے کی تجویز پیش کرتے ہیں تو ہمارے پیشِ نظر یہ بات ہوتی ہے کہ دستور چونکہ ہر ملک میں ایک مقدّس دستاویز ہوتی ہے اور اس سے اعلیٰ وارفع کوئی دستاویز نہیں ہوتی، اس لیے اس کا ہر نقطہ، شوشہ اور حرف قابلِ حجت ہوتا ہے۔ لہٰذا دستور کے ان خصائص کی بناء پر ایک اسلامی ریاست میں یہ حیثیت صرف قرآنِ مجید کو حاصل ہے کہ وہ مسلمانوں کی مقدّس ترین دستاویز کہلائے اور اپنائے جانے کا بھی مستحق قرار پائے۔ یہ ضروری ہے کہ کسی تحریر کو بھی اس کے ہم پلہ یا اس سے اعلیٰ قرار نہ دیا جائے، نہ ہی اس کے مقابلے میں انسانی فکر کے زائیدہ کسی دستور وقانون کو لا کر کھڑا کیا جائے۔ ہم اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کی منشاء اور حکم سے صرف سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنے اس دستور یعنی قرآنِ مجید کی آخری اور حتمی تعبیر کا درجہ دے سکتے ہیں۔ کیونکہ سنّت کی حیثیت قرآنی فکر کے عملی نمونے کی ہے، جس سے سرِ مو انحراف قرآنِ مجید سے انحراف کے مترادف ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم، الفاظ ومعانی اور جسم وروح کی حیثیت رکھتی ہیں اور سنّت کی یہ حیثیت اور منزلت قرآنِ مجید سے حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے گہرے ربط کی بناء پر ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے رسول اکرم ﷺ کی سیرت و اخلاق کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا "خُلُقُہُ الْقُرْآن" یعنی "آپ ﷺ کی سیرت و کردار عین قرآن ہے۔"

حضورِ اکرم ﷺ کی سیرت و اسوہ کا دوسرا نام ہی سنّت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک گمراہ فرقے نے کتاب و سنّت میں تضاد اور تفریق پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس طرح شبہات پھیلائے کہ سنت و حدیث کو پرکھنے کے لیے اسے قرآن پر پیش کرنا ضروری ہے تو حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے تلخ لہجے میں فرمایا کہ:

"تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم آنی چاہیے، کیا رسولِ اکرم ﷺ (معاذ اللہ) قرآنِ کریم کی مخالفت کر سکتے تھے کہ ہم آپ ﷺ کے فرمان کے لیے کوئی معیار اور کسوٹی تلاش کرنے کی جسارت کریں؟" (مسند دارمی)

امام شافعی رحمہ اللہ نے ایسے ہی شبہات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"رسولِ اکرم ﷺ کا ہر قول و فعل قرآنِ کریم کا ہی مفہوم ہے۔ آپ ﷺ نے ایسی کوئی بات کبھی کہی نہ کی جو قرآنِ مجید سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔" (الرسالہ۔ امام شافعیؒ)

گویا آپ ﷺ کا فہمِ قرآن بھی الہامی اور ربانی تھا اور قرآنِ مجید کی اکملیت کا راز اسی میں مضمر ہے کہ اس کا صحیح فہم اور تعبیر سنّت کی صورت میں موجود ہو۔ غور فرمائیے، کہ دنیا بھر میں صرف اسلامی دستور یعنی قرآنِ کریم کو ہی اعزاز حاصل ہے کہ اس کی تعبیر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین شکل میں سب کے سامنے موجود ہے اور جس طرح یہ دستور اختلافات سے پاک ہے۔ اسی طرح اس کی صحیح (ثابت شدہ) تعبیر و تشریح بھی اختلافات سے مبرا ہے۔

اس ضمن میں ایک بڑے مغالطے کا ازالہ ضروری ہے جو مختلف شکلوں میں مختلف حلقوں کی طرف سے پھیلایا جاتا ہے کہ اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر بعض احادیث بعض دوسری احادیث سے مختلف کیوں نظر آتی ہیں؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ اس کی وجہ عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ ہم احادیث کی صحت و ضعف کو پرکھے بغیر مفہوم کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ایسی احادیث ضعیف ہوتی ہیں۔ جن کی صراحت محدثین نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مؤلفات میں کر دی ہے بلکہ درایتِ حدیث بشمول اسماء الرجال کے نام سے کسی حدیث کی صحت کو جانچنے کا ایسا فن محدثین نے پیش کیا ہے، جس کی علم وفن کی دنیا میں کوئی دوسری مثال نہیں۔ جب جانچ اور پرکھ کا یہ حال ہو تو کوئی صحیح حدیث، کسی دوسری صحیح حدیث کے خلاف کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ بالکل ناممکن بات ہے۔

بالفرض اگر کوئی صحیح حدیث کسی دوسری حدیث سے بظاہر مختلف نظر آئے بھی تو اسے اسی نظر سے دیکھا جائے گا، جس نظر سے قرآن کی بعض آیات بعض دوسری آیات سے بظاہر مختلف نظر آتی ہیں۔ چونکہ اخلاص سے غور وتدبر کرنے کے بعد قرآن کا قرآن سے یہ ظاہری اختلاف ختم ہو جاتا ہے، اسی طرح کسی صحیح حدیث کا کسی دوسری حدیث سے اختلاف بھی بادنیٰ تامل ختم ہو جاتے گا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کتاب وسنت دونوں اللہ کی طرف سے وحی ہیں، تو وحی میں کسی اختلاف کا پایا جانا اللہ تعالیٰ کی مرضی اور منشاء میں اختلاف قرار پاتے گا، جو ناممکن ہے۔

اس بارے میں قرآنِ مجید ہی میں واضح ارشاد ہے:

" وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا "

(النساء: ۸۲)

کہ" اگر قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے!"

چونکہ قرآنِ کریم کی طرح سنتِ رسول اللہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہامی چیز ہے، اس لیے اس میں اختلاف کا پایا جانا بھی بعید از عقل ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عصمت اور حفاظت اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی ہے اور رسول اللہ کا قول وفعل یا کسی چیز کو بیان کرنا ان کی ذات سے الگ کوئی چیز نہیں اس لیے اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

" إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ..... ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ! "

(القیامۃ: ۱۷، ۱۹)

یعنی" قرآن کا جمع کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے..... پھر..... اس کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے"۔ یہاں بیان سے مراد سنتِ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ کسی ملک میں دستور کی تشکیل و توضیع کے بعد جب اس کی تعبیر کا مرحلہ آتا ہے تو اختلاف کا پیدا ہونا عین فطری ہے، لیکن اسلام میں تعبیر دستور بھی متفقہ ہے اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو اسے سب سے ممتاز اور برتر دستور تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اعلیٰ عدالتوں میں جب بسا اوقات حکومت کے قوانین اور ماتحت عدالتوں کے فیصلوں کو چیلنج کیا جاتا ہے تو مدعی اور مدعا علیہ ایک ہی دستور سے اپنے اپنے حق میں دلائل پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس طرح کے قانونی نظائر اور فیصلوں کے اختلافات کو کوئی شخص بھی دستور کا نقص قرار نہیں دیتا، اور نہ دے سکتا ہے۔ حالانکہ یہ فیصلے آپس میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ اس کی حیثیت محض تشریح قانون کی ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلام چونکہ فقہی آراء کو دستوری حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا اور صرف سنّت کو تعبیرِ دستور کا درجہ دیتا ہے، جو ہر طرح کے اختلافات سے پاک ہے اس لیے فقہی آراء کی حیثیت شریعت میں صرف انہی قانونی نظائر اور فیصلوں کی سی ہے جن کو دستور کا سقم قرار دینا بالکل بے معنی ہے اور اس طرح فقہی آراء کو زیادہ سے زیادہ وہی حیثیت دی جا سکتی ہے جو اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں یا قانونی نظائر کو حاصل ہے جنہیں عدالتوں میں ہر فریق محض اپنے موقف کو مضبوط کرنے یا حالات و واقعات کے زیادہ قریب ہونے کی بناء پر بطورِ دلیل پیش کرتا ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ ان فقہی آراء کی اس حیثیت کے باوجود ان کے اختلافات سے نجات حاصل کرنے کی راہ بھی ہمیں بتا دی گئی ہے۔ چنانچہ اس بات سے کسی کو اختلاف نہیں کہ اصل چیز دین یعنی اطاعتِ الٰہی ہے۔ لہٰذا فقہی آراء کو کتاب و سنّت کے ایک معاون کی حیثیت سے سامنے رکھ کر کتاب و سنّت کی منشاء سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور جو رائے کتاب و سنّت کے مطابق ہو اسے فیصلہ کے وقت اختیار کرنا چاہیے اور جو رائے کتاب و سنت سے مطابقت نہ رکھتی ہو اس کو چھوڑ دینا چاہیئے کیونکہ کتاب و سنّت اللہ تعالیٰ کی رضا اور منشاء کا نام ہے۔ بالفاظِ دیگر اسلام نے فقہی اختلافات کو دستوری حیثیت نہ دینے کے باوجود، ان کے مضر اثرات سے محفوظ رہنے کا طریقہ بھی بتا دیا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی وغیرہ،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جن حضرات نے کتاب وسنت سے براہِ راست راہنمائی لینے کی طرف جو توجہ دلائی ہے، یہاں تک تو ان کی بات بالکل درست ہے۔ لیکن ان کے ہاں اصل مغالطہ یہ ہے کہ انہوں نے کتاب وسنت سے حاصل کردہ فہم کو بھی دستوری حیثیت دینے اور اُن کو قانون کے ساتھ شامل کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ جو قابلِ قبول نہیں، اور جس کی وجہ ہم اُوپر بیان کر چکے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور نقطہ نظر کہ تغیّر زمانہ سے فقہاء کے اجتہادات کو بدلا جا سکتا ہے اور وُہ سابقہ فقہیں جنھیں خاص ادوار میں اہم حیثیت حاصل رہی ہے۔ وُہ بھی اصولِ اجتہاد کے تحت بدلی جا سکتی ہیں، چونکہ یہ بات لچک اور وسعت کی طرف اشارہ کرتی ہے، اس لیے اہلِ فقہ کا یہ کہنا ہے کہ ماضی کی طرح اب بھی فقہ کو ہی اسلامی مملکت کا دستور ہونا چاہیے اور جہاں کہیں تغیّر زمانہ متقاضی ہو، اس میں اصول اجماع کے تحت ترمیم کر دی جائے۔ لیکن تھوڑے سے غور وفکر کے بعد یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ایک ہی غلطی ایک اور رنگ میں دہرائی جا رہی ہے۔ حالانکہ قرآن مجید کو دستور قرار دینے اور سنّت کو اس کی آخری حتمی تعبیر مان لینے کے بعد کسی ایسی تبدیلی کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی، جو طرح طرح کے اختلافات کا پیش خیمہ ہے۔ اس طرح اسلامی مملکت کے دستور کی دائمی اور اصل حیثیت مجروح ہونے سے بھی محفوظ رہ جاتی ہے اور یہ دوسری خصوصیت ہے جو صرف اسلامی دستور کا حصّہ ہے۔

البتہ کتاب وسنّت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اگر مخصوص حالات اور تغیّر زمانہ سے کچھ لازماً اثرات پڑتے ہیں، جن کی وجہ سے بسا اوقات مختلف فتاوی اور آراء کا تنوع سامنے آتا ہے تو کتاب وسنّت کی منشاء کو حالات کی تبدیلی پر لاگو کرتے ہوئے اس کی کچھ نہ کچھ گنجائش بھی بہر حال موجود ہے یعنی کسی خاص واقعہ یا خاص حالات کی بناء پر ایک فتویٰ دیا گیا اور حالات کے بدلنے سے مجبوراً دوسرا فتویٰ دینا پڑا۔ جہاں تک اس گنجائش کا تعلق ہے تو یہ گنجائش خود کتاب وسنّت کی نصوص میں موجود ہے اور اسی توسّع کی بناء پر رسالتِ محمدیہؐ کو ابدی قرار دیا گیا ہے۔ انسانی دساتیر اس وقت تک قابلِ قبول قرار نہیں پاتے جب تک ان میں لچک اور وسعت نہ پائی جاتی ہو اور کسی دستور کے تحت اسی دستور میں ترمیم کی گنجائش موجود نہ ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چاہے اس ترمیم کے لیے بڑی کڑی شرائط ہی کیوں نہ رکھی گئی ہوں۔ اس کے برعکس چونکہ کتاب وسنّت وحی ہیں اور عالم الغیب ہستی کی طرف سے ہیں، لہٰذا ہم اس میں کسی تبدیلی کے مجاز نہیں ہیں اور نہ ہی اس کی ضرورت پاتے ہیں۔ یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب وسنّت کے نفاذ کی ابدیت اور قطعیت کی وضاحت بھی کر دی جائے۔

کیونکہ کتاب وسنّت کی اس ابدیت اور قطعیت کے باوجود مختلف حلقوں سے یہ مطالبہ بار بار کیا جاتا ہے کہ ہم نفاذِ شریعت چاہتے ہیں اور یہی مطالبہ حکومت سے کیا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں لفظِ نفاذ ان معنوں میں مشہور ہو چکا ہے کہ جب تک کوئی قانون سرکاری سطح پر نافذ العمل نہ ہو، اس کو نافذ نہیں سمجھا جاتا۔ حالانکہ یہ خاصہ دنیاوی اور وضعی قوانین کا ہے، شریعتِ محمدی کا نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُسے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ذریعے تا قیامت نافذ کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سرکاری اعلان کے بغیر نماز پڑھتے، روزہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح شادی بیاہ، وراثت، وصیت اور دوسرے احکام پر کسی سرکاری اعلان کے بغیر عمل کرتے ہیں اسی بناء پر اللہ کا خوف کھانے والے اپنی اپنی تجارتوں میں سُود اور جوا سے پرہیز کرتے ہیں۔ اگر یہ سب چیزیں نافذ نہ ہوں تو ان پر عمل کیوں ضروری ہے؟ جبکہ قانون پر عمل اسی وقت ضروری ہوتا ہے جب وُہ نافذ العمل ہو[1]

دراصل حکومتوں سے اس مطالبہ کہ وُہ اسلامی قانون نافذ کریں، کا مقصد یہ ہے کہ جو احکام شریعت نے حکومت کو دیے ہیں وُہ ان پر عمل پیرا ہو۔ جیسے حدود و تعزیرات کا

---

[1] ایک دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کا انداز دستوری نہیں۔ دراصل یہ مغالطہ اس لیے ہوا ہے کہ اس نظریہ کی بنیاد مذہب وسیاست کی تقسیم پر ہے اور جدید دستوروں کا تعلق صرف سیاسیات سے ہوتا ہے جبکہ قرآنِ کریم دستورِ زندگی ہے اور اس کا انداز بھی دینی اور معاشرتی مسائل کی تنظیم، راہنمائی اور فکرِ آخرت سے ہے۔ اس اعتبار سے اس کا انداز انسانی فطرت سے نہایت مناسب ہے نیز جدید سیاسی تصورات کی رُو سے بھی دستور کی دفعہ وار ترتیب ضروری نہ ہے کیونکہ دستور غیر تحریری بھی ہو سکتا ہے جو رسم ورواج پر مبنی ہوتا ہے جن کی قانونی تشریح ہو چکی ہو۔ برطانیہ کا عرفِ علم (COMMON LAW) اس کی واضح مثال ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اقامت صلوٰۃ، ادائے زکوٰۃ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر وغیرہ۔ یہاں پر لفظِ نفاذ کا استعمال اپنے معروف معنوں میں غلط ہے۔ کیونکہ اسلامی حکومت کا یہ کام نہیں کہ وہ شریعت کا کوئی حصہ وضع کرے اور اس کے بعد اسے نافذ کرے، بلکہ حکومت ہو یا فرد، ان کا فرض یہ ہے کہ وہ شریعتِ محمدیہ کے جملہ احکام پورے کریں۔ اس میں اکثر احکام کے مخاطب فرد و حکومت دونوں ہیں اور بعض احکام میں کسی ایک کی ذمہ داری زیادہ ہے۔ تاہم ہر دو صورتوں میں احکام بجالانے کے فرد و حکومت دونوں مخاطب ہیں۔ اور اگر کوئی کوتاہی ہوتی ہے تو وہ قابلِ گرفت ہوگی۔ اور اگر فرد، ان احکام کو تسلیم کرنے، یا حکومت ان احکام کے اعلان سے انکار کرے تو وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ شریعتِ محمدیؐ کی اطاعت کا مطالبہ کرنے والے لفظِ نفاذ کو ذو معنی ہونے کی بناء پر ترک کردیں اور نفاذِ شریعت کی بجائے اطاعتِ شریعت، اقامتِ دین، یا شریعت کی عملداری کی ترکیبات استعمال کریں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ متذکرہ بالا ساتوں نقطہائے نظر جزوی طور پر اپنے اندر کچھ نہ کچھ درستی رکھنے کے باوجود، بحیثیتِ مجموعی غلط ہیں۔ صحیح نقطہ نظر یہ ہے کہ کتاب و سنت کی حیثیت دستوری ہے جو تاقیامت نافذ العمل ہے، اس میں نہ تو کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے اور نہ تنسیخ!

ویسے بھی ایک مسلم ریاست میں کتاب و سنّت کی راہنمائی کی موجودگی میں کسی جدید قانون و دستور کی توضیع و اختراع صریح بدعت کے مترادف ہے، اور تعلیماتِ شریعت سے کھلی بغاوت!

یہاں پر سعودی عرب کی مثال ہمارے لیے مشعلِ راہ بن سکتی ہے، جہاں کتاب و سنت کے علاوہ کوئی مدوّن دستور و قانون نافذ العمل نہ ہے۔ حتیٰ کہ سعودی حکومت قرآنِ کریم کو بطورِ دستور اقوامِ متحدہ میں پیش کر چکی ہے۔

آخر میں ایک بار پھر ہم تکرار کریں گے کہ ہمارے نزدیک دستوری حیثیت صرف کتاب و سنت کو حاصل ہے اور وہ تاقیامت نافذ العمل ہے اور اس میں نہ تو کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کے کسی حکم یا شق کو منسوخ کیا جا سکتا ہے!

—— فرد ہو یا حکومت، دونوں اس کے پابند ہیں۔ ان کے جملہ امور اسی کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعلیمات کی روشنی میں انجام پانے چاہئیں اور جملہ پابندیاں بھی وہی گوارا ہیں جو کتاب و سنت کی رُو سے لاگو ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو آزاد پیدا کیا ہے، اس لیے آزادی اس کا پیدائشی حق ہے، نیز اس کی آزادی کی حدود اور دائرہ کار متعین کرنے والا بھی وہی خود ہے!

یاد رہے، ہمارا نقطہ نظر دین میں کوئی نئی بات نہیں۔ بلکہ یہ وہ بنیاد ہے جس پر چودہ سو سال پہلے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک مملکت کے تمام امور کی بنیاد رکھی تھی۔ اور خلفاء راشدین اسی بنیاد پر نظمِ حکومت چلاتے رہے۔ فرمانِ رسولؐ ہے: "عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ" کہ "میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑو۔"

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین!

خلافت و جمہوریت

دورِ حاضر کا ایک نہایت اہم مسئلہ

مغربی جمہوریت موجودہ دور کا سب سے بڑا بت ہے جس کو گرائے بغیر اقامتِ دین ممکن نہیں کہ اسلامی نظامِ حیات سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، جبکہ ہم نفاذِ اسلام کے ساتھ ساتھ اس کو بھی گلے لگائے رکھنا ضروری سمجھتے ہیں

فاضلِ محترم **مولانا عبدالرحمان کیلانی** کے رجحانِ کتاب و سنت اور حقیقت نگار قلم سے

قیمت ۱۵ روپے ——— مجلد ۱۸ روپے

ناشر: ادارہ محدث **مجلس التحقیق الاسلامی** - ۹۹ جے ماڈل ٹاؤن

لاہور ۱۴

© rasailojaraid.com